دوسری اور آخری قسط

اقبال کا پیغام

عصر حاضر کے نام

از جناب مولوی قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت ایم۔اے (علیگ)

علامہ اقبال اپنے وسیع مطالعہ اور صحیح ذوق و وجدان کی بنا پر اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں۔ اپنے مقالہ "فلسفہ عجم" کے سلسلہ میں اقبال نے مغربی و مشرقی فلسفے کا نہایت گہرا اور وسیع مطالعہ کیا تھا۔ مغربی مفکرین میں افلاطون۔ اگسٹائن۔ سینٹ فرانسیس۔ اگناٹس لائیلا۔ میدام وی گایان براؤلے۔ الگزنڈر۔ ہیگل۔ نطشے۔ برگسان اور مشرقی صوفیا و حکماء میں امام غزالی، رومی، حافظ، شیخ سرہندی، شنکر آچاریہ، ریک ناتھ اور دگمبر وغیرہ کے خیالات کا اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ اس وسیع مطالعہ نے اقبال پر ایک بات بہت واضح کردی اور وہ یہ کہ "قرآن ہدایت انسانی کے لیے آخری صحیفہ ہے" وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر انسان اس کا مطالعہ خشوع و خضوع سے کرے تو اس پر کائنات کے تمام اسرار سربستہ کھل جائیں۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس قرآن کی عملی تفسیر ہے۔ ختم نبوت کے لیے وہ ایک انوکھی دلیل سے کام لیتے تھے، ان کا کہنا ہے کہ محمد رسول اللہؐ پر نبوت اس لیے ختم ہو گئی کہ انہوں نے انسانیت کو ایک ایسا نظام زندگی دیا جو عقل پر مبنی ہے۔ معجزات کی ضرورت اب اس لیے باقی نہیں کہ انسانی عقل اب اپنی فلاح و بہبود کے وسائل خود متعین کر سکتی ہے۔ قرآن کی تعلیمات اور عقل انسانی میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں

ہے۔ انسانی نشوونما کے لیے جن بنیادی قوانین اور اصولوں کی ضرورت ہے وہ دے دیے گئے ہیں ۔ ان اصولوں میں تبدیلی نہیں ہو سکتی البتہ ان کی روشنی میں ضرورت زمانہ کے مطابق اجتہاد سے کام لیا جا سکتا ہے۔

اقبال کی نظر میں عہدِ حاضر کا انسان جو قلب و نظر کے امراض فاسدہ میں مبتلا ہے تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے انبیاء علیہم السلام کے پیش کردہ دین فطرت یعنی اسلام کے اصولوں کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور نتیجہ کے طور پر تشکک ولادینیت، جبریت وذواقیت کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ آیئے کچھ دیر کے لیے اقبال کے ساتھ ان روحانی امراض پر ایک نظر ڈالیں۔

(۱) تشکیک ولادینی: تہذیب حاضر کے زیر اثر جو نسل پیدا ہوئی ہے اس کی نظر میں مذہب ایک "جنون خام" ہے اور "ہستی غایب" کی تلاش کرنے والے احمق ونادان ہیں۔ علوم جدیدہ کی بنا محسوس پر ہے۔ اس لیے موجود وہی ہے جو محسوس ہے۔ حقیقت کا علم ہمیں ادراک، مشاہدہ اور ارتسام کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اور ہمارے تمام تصورات ان ہی ارتسامات کی نقول ہیں گویا ارتسام تصور کی اصل ہے۔ بالفاظ دیگر ہمارے لیے حقیقی چیز وہی ہوگی جس کو ہم محسوس کریں مذہب کا معروض "ہستی غایب" ہے جس کا کوئی ادراک یا احساس ممکن نہیں لہٰذا اس کا کوئی علم قابل حصول نہیں اس کی تلاش ایک سیاہ بلی کی تلاش ہے جو ایک تاریک کمرہ میں کی جارہی ہے جو اس کمرہ میں موجود نہیں ہے۔" یہ ہے استدلال دور حاضر کے نوجوان انسانوں کا جو اپنا مسلک مذہب کے خلاف انتہائی تجربیت یا احساسیت کو قرار دیتے ہیں۔ اقبال نے اس کو اس طرح ادا کیا ہے۔

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ ناداں ہیں جن کو ہستی غایب کی ہے تلاش
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے ایک جنون خام ہے جس سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش
کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور مجھ پر کیا یہ مرشد کامل نے راز فاش
باہر کمال اند کے آشفتگی خوش است ہر چند عقل کل شدہ بے جنون مباش

بے عقل مباش "ہی میں حقیقی انسانیت کی فلاح و بہبود ہے لیکن بقول حسرت مرحوم۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

آج مذہب سے بے زاری کا نتیجہ یہ ہے کہ عصر حاضر کے نوجوان کے لیے نہ زندگی کی کوئی غایت ہے اور نہ تخلیق کائنات کی کوئی غرض یا مقصد بلکہ وہ اس سوال ہی کو لایعنی سمجھتے ہیں کہ کیا زندگی کی کوئی غایت ہو سکتی ہے اور عالم کا کوئی مقصد؟

مسلمانوں کی نئی پود میں لادینی اور الحاد کے اسی میلان کو علامہ اقبالؔ نے "فردوس بریں" کی مشہور نظم میں مکالمہ کی صورت میں اس طرح پیش فرمایا ہے ؂

ہاتف نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز
حالیؔ سے مخاطب ہوئے یوں سعدیؔ شیراز
کچھ کیفیتِ مسلم ہندی تو بیاں کر
وا ماندہ منزل ہے کہ مصروف تگ و تاز
مذہب کی حرارت بھی ہے کچھ اس کی رگوں میں
تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمی آواز
باتوں سے ہوا شیخ کے حالیؔ متاثر
رو رو کے لگا کہنے کہ اے صاحب اعجاز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر و زمیں تاز
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

الحاد کے انداز پیدا ہوتے ہی کردار میں تغیر کا رونما ہونا ضروری تھا۔ اوامر نواہی کی پابندی اور رضائے الٰہی کا خیال، سزا کا خوف اور جزا کی امید، یہ سب محرکات ہمارے عصر حاضر کے نوجوانوں کے نزدیک نہ قابل التفات ہیں اور نہ لایق توجہ۔

جدید نفسیات یا تحلیلی نفسیات (Psycho- Analysis) نے نوجوانوں کو تعلیم دی ہے کہ ذہن انسانی کا بیشتر حصہ غیر شعوری ہے۔ انسانی شخصیت کی مثال برف کے اس انبار کی سی ہے جو سمندروں میں بہتا رہتا ہے اس کا صرف تھوڑا سا حصہ سطح کے اوپر نظر آتا ہے باقی سب نیچے پوشیدہ ہوتا ہے یہ حصہ جس کو غیر شعوری نفس کہا جاتا ہے نہ صرف نسبتاً زیادہ بڑا بلکہ اہمیت کے لحاظ سے بھی نفس شعوری سے کہیں زیادہ عظیم الشان ہوتا ہے۔ شعور میں جو کچھ نمایاں ہوتا ہے وہ غیر شعوری نفس ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان کے ذہن کا شعوری حصہ اہمیت کی چیز نہیں اس لیے کہ اس کا سارا مواد اور اس کے سارے اعمال و وظائف ان قوتوں کے اظہار ہیں جن کا نہ ہمیں عام طور پر علم ہوتا ہے اور نہ یہ ہمارے تصرف واختیار میں ہوتے ہیں۔ اس طرح جب کسی غیر شعوری خواہش کا ظہور شعور میں ہوتا ہے تو وہ ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی لہٰذا ہم اپنی سیرت کے آپ معمار نہیں ہماری سیرت نتیجہ ہے ان تاثرات، تحریصات، ترغیبات اور قوتوں کے باہمی

عمل یا تعامل کا جو غیر شعوری نفس میں جاری ہیں اور جن کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ اگر ہم سے کہا جائے کہ ہمیں ضبط نفس سے کام لینا چاہیے۔ بُری خواہشات کو دبانا چاہیے اور ان کی نفی کرنا چاہیے تو یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔

اگر ہم ان کے ضبط پر قادر بھی ہوں تو جدید نفسیات کی تعلیم ہے کہ ان کی نفی یا ان کا دبا دینا ہماری ذہنی صحت کے لیے سخت مضر ہوتا ہے۔ آسکر وائلڈ کا کہنا ہے کہ کسی خواہش نفسی سے نجات پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کی تکمیل کرلی جائے۔

ہماری توانائی و قوت کے مبداء اصلی کو جو ڈی بی ڈو (Dibido) کہلاتا ہے فرائیڈ اس کو چشمہ آب سے تشبیہ دیتا ہے جو زمین کے نیچے بہہ رہا ہے اور کسی مخرج کی تلاش میں ہے اگر تم اس چشمہ کو پشتہ لگا کر روک دو اور اس کے پانی کو بہہ کر نکلنے کا موقع نہ دو تو پھر یہ بند ہو کر کیچڑ پیدا کرتا ہے یہ کیچڑ گویا مؤلفات (Complexes) ہیں اور بخارات عہد حاضر کی زندگی کے وہ بے شمار عصبی امراض (Neurosis) اور سقیم خوف (Phobias) جن کا نفسی تحلیل علاج کرنا چاہتی ہے اور علاج کا طریقہ بس یہی ہے کہ ان رکی دبی خواہشات کو ظاہر ہونے دیا جائے۔

لیکن اس کے برخلاف دین و مذہب کی روح تو یہ ہے کہ اوامر الٰہی کے امتثال اور نواہی سے اجتناب کی کوشش کی جائے۔ اور جدید نفسیات کی تعلیم یہ ہے کہ خواہشات کو بے لگام رکھنا ہی صحتِ ذات کے لیے ضروری ہے اسی ہوس رانی کا اصطلاحی نام اظہار ذات (Self-Expression) ہے جس کو (D.H.Lawrence) وغیرہ کے ناولوں نے عام فہم بنادیا ہے۔

بہر حال ان تعلیمات وخیالات نے مذہب اخلاق کی بیخ کنی کردی۔ نوجوان کے قلوب مسخ ہوگئے، دل تیرہ اور نگاہ بے باک ہوگئی۔ ان کی عقل اور ان کا دل "طواف آب و گل" میں گرفتار ہوگیا۔ "جاوید نامہ" میں اسی حالت کا نقشہ ان دردناک الفاظ میں پیش کیا ہے۔

گر خدا سازد ترا صاحب نظر　　روزگارے را کہ می آید نگر
عقلہا بے باک و دلہا بے گداز　　چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز
علم و فن، دین و سیاست، عقل و دل　　زوج زوج اندر طواف آب و گل

آگے چل کر کچھ اور وضاحت کی گئی ہے۔

نوجواناں تشنہ لب خالی لیاغ　　شستہ رو تاریک جاں روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و ناامید　　چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید

نوجوانوں نے دین فطرت کو ہاتھ سے کھو کر اور عقل واستدلال کو اختیار کر کے کیا پایا؟ مادی عقل نے ان کے قلوب میں کیا انقلاب پیدا کر دیا؟ ان کے نقطۂ نظر کے بدل جانے سے جہان اور جہان کے چار سو، ان کے لیے کیسے بدل گئے۔ اقبال کو جو نظر آیا وہ یہ تھا۔

جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب　　دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک

یعنی روح اخلاقی اقدار سے محروم ہو کر لاغر ہونے لگی اس کے عوض تن میں فربہی پیدا ہونے لگی لیکن نگاہ کی وسعت اور یقین کا ذوق، ایمان کا گداز، روح کی پاکیزگی اور عفت ان سے رخصت ہو گئی

(۲) جبریت : جدید تحلیلی نفسیات کی تعلیم کے بارے میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہمارے تمام شعوری ارادات و واقعات کا مبداء اصلی غیر شعوری نفس ہے گویا ہماری خواہشات اور افکار عکس میں ہمارے غیر شعوری عناصر کا جو غایب و غیر معلوم ہیں اور ہمارے اختیار سے باہر اس لیے ہم اپنے شعوری افکار و خواہشات کے ذمہ دار نہیں۔ لہٰذا پرستان مذہب واخلاق کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ ہمارا ارادہ آزاد ہے اور وہ ہمارے افکار وخواہشات پر حکمرانی کرتا ہے انہیں اپنے اقتدار میں رکھتا ہے جو خواہشات کہ ہماری روح کے مفاد کے خلاف ہوتی ہیں انہیں ترک کر دیتا ہے اور جو اس کی فلاح کی معاون ہوتی ہیں انہیں کو اختیار کرتا ہے صحیح یہ ہے کہ جبلتیں ہی انسانی اعمال کی حقیقی محرکات ہیں اور انہیں جبلتوں کی تشفی کے لیے ہم عمل کرتے ہیں جن پر ہمیں کوئی اقتدار حاصل نہیں اس لیے "اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا" ہمیں اپنے حال پر رہنے دے یہ ہے عقیدۂ جبریت آج انسان کے اندر جبریت کا اثر "عقیدۂ تقدیر" کی غلط فہمی کی وجہ سے زہر کی طرح سرایت کر گیا ہے اور ان کے عمل کی قوت کو مفلوج کر دیا ہے۔ نہ صوفی میں مجاہدانہ حرارت رہی اور نہ سالک میں مستی کردار۔ شاعر کی نوا افسردہ و بے ذوق ہو کر رہ گئی۔ مرد مجاہد مفقود ہو گیا۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال　　ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مُردہ و افسردہ و بے ذوق　　افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو　　ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

نوجواناں تشنہ لب خالی ایاغ　　شستہ رو تاریک جاں روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و ناامید　　چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید

نوجوانوں نے دین فطرت کو ہاتھ سے کھو کر اور عقل واستدلال کو اختیار کر کے کیا پایا؟ مادی عقل نے ان کے قلوب میں کیا انقلاب پیدا کر دیا؟ ان کے نقطۂ نظر کے بدل جانے سے جہان اور جہان کے چار سو، ان کے لیے کیسے بدل گئے۔ اقبال کو جو نظر آیا وہ یہ تھا۔

جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب　　دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک

یعنی روح اخلاقی اقدار سے محروم ہو کر لاغر ہونے لگی اس کے عوض تن میں فربہی پیدا ہونے لگی لیکن نگاہ کی وسعت اور یقین کا ذوق، ایمان کا گداز، روح کی پاکیزگی اور عفت ان سے رخصت ہو گئی

(۲) جبریت : جدید تحلیلی نفسیات کی تعلیم کے بارے میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہمارے تمام شعوری ارادات و واقعات کا مبداء اصلی غیر شعوری نفس ہے گویا ہماری خواہشات اور افکار عکس میں ہمارے غیر شعوری عناصر کا جو غایب و غیر معلوم ہیں اور ہمارے اختیار سے باہر اس لیے ہم اپنے شعوری افکار و خواہشات کے ذمہ دار نہیں ۔ لہٰذا پرستان مذہب واخلاق کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ ہمارا ارادہ آزاد ہے اور وہ ہمارے افکار و خواہشات پر حکمرانی کرتا ہے انہیں اپنے اقتدار میں رکھتا ہے جو خواہشات کہ ہماری روح کے مفاد کے خلاف ہوتی ہیں انہیں ترک کر دیتا ہے اور جو اس کی فلاح کی معاون ہوتی ہیں انہیں کو اختیار کرتا ہے صحیح یہ ہے کہ جبلتیں ہی انسانی اعمال کی حقیقی محرکات ہیں ،اور انہیں جبلتوں کی تشفی کے لیے ہم عمل کرتے ہیں جن پر ہمیں کوئی اقتدار حاصل نہیں اس لیے "اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا" ہمیں اپنے حال پر رہنے دے یہ ہے عقیدۂ جبریت آج انسان کے اندر جبریت کا اثر "عقیدۂ تقدیر" کی غلط فہمی کی وجہ سے زہر کی طرح سرایت کر گیا ہے اور ان کے عمل کی قوت کو مفلوج کر دیا ہے۔ نہ صوفی میں مجاہدانہ حرارت رہی اور نہ سالک میں مستی کردار۔ شاعر کی نوا افسردہ و بے ذوق ہو کر رہ گئی۔ مرد مجاہد مفقود ہو گیا۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال　　ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مُردہ و افسردہ و بے ذوق　　افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو　　ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

تقدیر کے غلط عقیدے نے خاص کر مسلمانوں کو عمل سے غافل کر دیا۔ قسمت ہی میں ایسا لکھا تھا، کہہ کر وہ زندگی کی کشمکش سے کنارہ کش ہو گیا اور اپنی شکست تسلیم کر لی۔

گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی   اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

لذت اندوزی: اگر ہم عمل و مجاہدے سے اپنی زندگی کی تعمیر نہیں کر سکتے اگر ہم اپنے مستقبل کے سنوارنے میں اتنے ہی مجبور ہیں جتنے کہ اپنے ماضی کے بدلنے میں تو پھر ہمیں اپنی موجودہ زندگی سے وہ جیسی بھی کچھ ہے پوری طرح بہرہ اندوز ہونا چاہیے اور جو کچھ مل جائے اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے اسی کو کہتے ہیں "اگر زمانہ نسازد تو با زمانہ بساز۔" یہیں سے لطف اندوزی کی بنا پڑتی ہے۔ عصر حاضر نے اس کو یہ تعلیم دی کہ مذہب کا یہ فرمان کہ انسان کو ہوائے نفسانی کی مخالفت کرنی چاہیے اور خواہشاتِ طبعی کو شرع کے تحت رکھنا چاہیے نہ صرف ناقابلِ عمل ہے بلکہ شخصیتِ انسانی کے لیے قطعاً مضر بھی ہے۔ فرائڈ نے ذرا تفصیل سے بتایا کہ موجودہ زمانہ کی بے شمار ذہنی بیماریاں، عصبی امراض، ہسٹریا اور زندگی سے بیزاری اور عدم طمانیت نتیجہ ہیں فطری خواہشات کو دبانے اور روکنے کا۔ صحت و طمانیت کے لیے انکار ذات نہیں بلکہ اظہار ذات کی ضرورت ہے، نقد وقت کو ہاتھ سے کھونا شخصیت کی عمارت کو جڑ سے اکھاڑنا ہے اس لیے عصر حاضر کا انسان اس عقیدہ کا پورا قائل نظر آتا ہے کہ اوقات فرصت کو لذت اندوزی میں صرف کرنا چاہیے وہ ان افعال و اعمال کو لذت بخش تصور کرتا ہے جو ہوائے نفسانی کی تکمیل کرتے ہیں جو ظاہر ہے جنسی خواہشات، رقص و سرود اور لہو و لعب کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ خوشی و راحت محض نفس کی خاطر ہے زندگی کے فرائض کو انجام دینے کی خاطر نہیں۔ مختصر یہ کہ عصر حاضر کا نوجوان اقبال کے الفاظ میں بدن ہی میں غرق ہے اور جان سے بے خبر۔

ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں   در بدن غرق است و کم اندوز جاں

اقبال اس قوم کو اور اس قوم کے افراد کو جنہیں "کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ" یعنی تم بہترین گروہ ہو جو لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان و یقین رکھتے ہو کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا انہیں عصری آلودگیوں میں پھنسا ہوا دیکھتے ہیں تو خون کے آنسو بہاتے ہیں اور درد و اضطراب کی حالت

میں ان کے مہلک امراض یعنی ان کے ظلمت آبادے چراغ ضمیر کو، ان کی غلامی اور حریت دشمنی کو، ان کی لادینی والحاد کو ان کی فرنگ مستی اور اپنی نوعیت وحقیت سے بیگانگی کو ان کی بزدلی اور موت سے خوفزدہ ہونے کو ان کی لذت پرستی اور عیش کوشی کو، یورپ کے باطل عقائد اپنے قلب کی پہنائیوں میں جگہ دے کر اور پھر ان کے آگے سجدہ ریز ہونے کو کس درد کے ساتھ سرور دو عالمؐ کے حضور میں پیش کرتے ہیں اور دعا طلب کرتے ہیں ۔

این مسلماں زادۂ روشن دماغ	ظلمت آباد، ضمیرش بے چراغ
مکتب ازوَے جذبہ دیں در ربود	از وجودش ایں قدر دانم کہ بود
مومن از رمزِ مرگ آگاہ نیست	در دِلش لا غالب الا اللہ نیست
از فرنگی می خرد لات و منات	مومن و اندیشۂ او سومنات
قم باذنی گوئے اوٗ را زندہ کن	در دِلش اللہ ہو را زندہ کن

نثرادِ نو کو خطاب کرکے "جاوید نامہ" میں اقبالؔ نے جو نصیحت کی ہے اس کا حاصل بس اتنا ہے کہ سادہ دلوں کے یقین کو فلسفیوں کے نکتہ ہائے دقیق پر ترجیح دے کر بے دلیل و برہان از روئے جان یعنی قلب کی گہرائیوں سے اپنے خالق کی الوہیت اور محمدؐ عربی کی رسالت کا اقرار کرلے۔

اقبالؔ کے نزدیک **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** پر ایمان کامل نہ ہونے کی وجہ سے آج دنیا مختلف قسم کے ذہنی ودماغی اور معاشی وعمرانی امراض میں مبتلا ہے۔ دنیا کی اکثر وبیشتر قومیں تو صرف ابھی لا کی منزل سے گزر رہی ہیں الا اللہ سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اقبالؔ کو تہذیبِ حاضر سے جو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ اس کی مجلس میں صرف شراب لا کا دور چل رہا ہے الا اللہ کی بوتل کا کہیں پتہ نہیں ۔

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے	مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا

لا بیشک نقش باطل کو مٹاتا ہے لیکن اس کے بعد نقش حق بھی تو ثبت کرنا چاہیے ورنہ مقصدِ حیات فوت ہو جائے گا۔

در مقام لا نیاساید حیات	سوئے الا می خرامد کائنات

جو قومیں صرف لا کا وظیفہ پڑھتی ہیں وہ اپنی طاقت انسانوں کو تباہ کرنے میں صرف کرنے لگتی

ہیں اور جب حد سے گزر جاتی ہیں تو خود تباہ ہو جاتی ہیں کیونکہ ۔

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے   نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف

اس لیے نفی کے بعد اثبات کرنے سے ہی زندگی کے مختلف شعبوں میں اعتدال وار توازن پیدا ہو سکتا ہے اور یہ اعتدال بنی آدم کے حق میں رحمت ہوتا ہے

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے چار صفحات کے اندر علامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں " لاالٰہ اللّٰہ " کی تفسیر پیش کی ہے جس کی تفصیلات خالی از طوالت نہیں لیکن اجمالاً دو ایک باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں، فرماتے ہیں ۔

نکتہ می گویم از مردانِ حال   امتاں را لا جلال الا جمال

یعنی توحید کی اصلیت و حقیقت سمجھنے کے لیے قال کی ادنیٰ منزل سے گزر کر حال کی منزل ارفع میں داخل ہونے کی ضرورت ہے جو لوگ اس تہ سے آشنا ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ؏ امتاں را لا جلال الا جمال۔ جلال سے مراد ہے قاہری اور جمال سے مراد ہے دلبری۔ قاہری دل میں خوف پیدا کرتی ہے اور دلبری دل میں محبت پیدا کرتی ہے اور یہ دونوں حیات انفرادی اور حیات اجتماعی کے لیے ضروری ہیں یعنی زندگی کی دو شانیں ہیں جن کے بغیر زندگی مکمل نہیں ہوتی قاہری و دلبری دونوں ایک ذات میں جمع ہو جائیں تو انسان میں پیغمبری کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن صرف دلبری جادوگری ہے اور صرف قاہری ابلیسیت ہے ۔

دلبری با قاہری پیغمبری است   دلبری بے قاہری جادوگری است

اسی طرح جب کوئی قوم لاالٰہ کا نعرہ بلند کرتی ہے خواہ وہ جرمنی ہو یا رومی، انگلشی ہو یا امریکن، عربی ہو یا کوئی اور تو وہ اپنے اقوال وافعال سے "دیگرے نیست کا اثبات کرتی ہے اس سے فرد و قوم دونوں کے اندر بے پناہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے اسی طاقت کا دوسرا نام جلال ہے لیکن جب کوئی قوم اس جلال کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہے کہ لاالٰہ کے بعد الااللہ بھی ہے تو وہ تقویٰ و طہارت، شرافت وانسانیت، رحمدلی و فیاضی وغیرہ صفاتِ حسنہ کی حامل بن جاتی ہے۔ اس کے اندر روحانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ حسین و جمیل بن جاتی ہے اور دنیا اس کے سایہ کے اندر آنا

چاہتی ہے۔ انفرادی طور پر جلال کو معہ جمال دیکھنا ہو تو عمر فاروق اور حیدر کرار کی سیرت پر نظر ڈالیے اور جلال کو بغیر جمال کے دیکھنا ہو تو اس کی کیفیت مہدی سوڈانی کی استخوانِ سوختہ سے پوچھیے یا چنگیز و ہٹلر میں دیکھیے، حیدر کرار کی خودی کو جس کے اقبالؔ مؤید ہیں حضور اکرمؐ کے حسین و جمیل ہاتھوں نے بنایا اور سنوارا ہے، ہٹلر کی خودی کو نطشے نے ترتیب دیا ہے وہ نطشے جس کے متعلق اقبالؔ کہتے ہیں ۔

حریف نکتہ توحید ہو سکا نہ حکیم　　نگاہ چاہیے اسرارِ لا الہ کے لیے
خدنگ سینۂ گردوں ہے اس کا فکرِ بلند　　کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کے لیے
اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی　　ترس رہی ہے مگر لذت گنہ کے لیے

نطشے کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہی ان تمام مشرقی و مغربی مفکرین و مصلحین پر منطبق کیا جاسکتا ہے جو کلمۂ توحید کے اسرار سے بے بہرہ ہیں نطشے کا "فوق البشر" عقلیت کا پجاری، عشق سے عاری اور ایمان سے خالی ہے اس کے نزدیک رزم گاہِ حیات میں نیکی نہیں بلکہ قوت درکار ہے تاکہ کمزوروں پر غلبہ کیا جاسکے، وہ اخلاقی خوبیوں کو کمزوری پر محمول کرتا ہے اور خیر و شر کو محض اضافی حیثیت دیتا ہے۔ وہ دراصل "بقائے اصلح" کے بجائے "بقائے اقویٰ" کا قائل ہے اس کے برخلاف اقبالؔ کے "انسان کامل" کا خمیر دین فطرت کی مٹی سے بنا ہے جس میں بہت سے اجزاء شامل ہیں۔ اس کا انسان کامل خودی کا پیکر ہے۔ عشق کا حامل ہے وہ عشق جہاں عقل کی سرحد ختم ہو جاتی ہے اور ذوق وجدان کی کارفرمائی شروع ہوتی ہے۔ وہ حیات و حرکت کا مجسمہ ہے۔ اور شریعت نبوی کا پابند۔ اس کا ایمان تابندہ، اس کی آرزو زندہ اور اس کا عزم و استقلال پائیدار۔ وہ دنیا کا بادشاہ ہے لیکن ایک مرد قلندر ہے جو روحانی قدور کے سامنے دنیا کی ہر چیز ٹھکرا دیتا ہے۔ وہ "بقائے اقویٰ" کے بجائے "بقائے اصلح" کا قائل ہے وہ قومی حاکم نہیں بلکہ انسانیت کا علمبردار ہے۔ بہر حال اقبالؔ تو عصر حاضر کے انسان کو "مرد قلندر" دیکھنا چاہتے ہیں جس کی پہچان اپنے بلیغ و شاعرانہ انداز میں ضرب کلیم کے صفحات میں اس طرح پیش کی ہے ۔

کہتا ہے زمانہ سے یہ درویش جواں مرد　　جاتا ہے جدھر بندۂ حق تو بھی اُدھر جا
میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوں گا　　چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تو تو اُتر جا